جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

علامہ محمد اسدؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

راہ وفا میں جذبۂ کامل ہو جن کے ساتھ
خود ان کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی

”تاریخ، بلا کسی شک وشبہہ کے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ کسی اور مذہب نے علمی وسائنسی ترقی کے لیے کم از کم اس طرح مہمیز کا کام نہیں کیا جس طرح اسلام نے۔ علمی وسائنسی تحقیقات کی اسلام نے جیسی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی، یہ اسی کا نتیجہ تھا جو ہم اموی، عباسی اور اسپین کی عرب حکمرانی کے زمانے میں تہذیبی ترقی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یورپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خود اس کی تہذیب پر اسلام کا قرض ہے، وہ قرض جو صدیوں کے اندھیرے کے بعد اسلام نے نشاۃ الثانیہ کی صورت میں یورپ کو دیا تھا۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہتا کہ ہم اپنے گزرے ہوئے ماضی پر فخر کریں، وہ بھی اس وقت جب کہ اسلامی دنیا نے اپنے ہی اقدار کو پامال کر دیا ہے اور ظلمتوں اور ذہنی غربت کی طرف پلٹ گئے ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اپنی موجودہ حالت میں اپنے ماضی پر فخر کریں۔ لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے موجودہ زوال کا ذمہ دار اسلامی تعلیمات کا نقص نہیں بلکہ ہماری بے عملیاں ہیں۔[۱۷]“

(محمد اسد)

محمد اسد

سوال، شکوک، بغاوت: محمد اسد (پہلے Leopold Weiss)، 2 جولائی 1900 میں آسٹروہینگرین سلطنت کے علاقے Lvov (موجودہ یوکرین) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک کٹر یہودی مذہبی خاندان تھا اور ان کے آباء واجداد میں بڑے بڑے یہودی ربی گزرے تھے۔ ان کے والد بیرسٹر تھے، مگر انہوں نے بیٹے کو روایتی تعلیم دلائی جو تورات، عہد نامہ قدیم، تلمود اور تورات کی دیگر شرحوں اور تفسیروں پر مشتمل تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ہی انھوں نے عبرانی اور آرامی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔ بیس برس کے ہوتے ہوتے انہوں نے جرمن، فرنچ اور پولش زبانوں میں بھی دستگاہ حاصل کرلی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ویانا کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ محمد اسد ایک عام سے طالب علم تھے جسے ریاضی اور سائنس سے نفرت تھی۔ انھیں تاریخ اور سماجی علوم پسند تھے۔ اپنے خاندان کے رواج کے مطابق آپ نے یہودیت کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ تو کرلیا لیکن یہ مطالعہ مذہب خصوصاً یہودیت پر یقین پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ انھیں عہد نامہ قدیم اور تلمود کا خدا رسم ورواج کے چکر میں پھنسا ہوا ایک قبائلی دیوتا لگتا تھا جو صرف ایک قوم یا نسل یعنی بنی اسرائیل کا خدا ہے نہ کہ ساری انسانیت کا۔ الغرض اس مذہبی تعلیم کا محمد اسد پر معکوس اثر ہوا اور وہ اپنے مذہب سے دن بہ دن دور ہوتے چلے گئے۔

بچپن سے آپ نے مہماتی طبیعت پائی تھی چنانچہ 1914 کے اخیر میں جب وہ صرف چودہ سال کے تھے تو اسکول سے بھاگ گئے اور آسٹریائی فوج میں بھرتی ہوگئے۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے بہت لمبے تھے اس لیے انھیں ایک جھوٹے نام کے تحت خود کو اٹھارہ سال کا بتا کر فوج میں گھسنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی، لیکن ان کے والد نے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی پولیس کی مدد سے ان کا پتہ چلالیا اور انھیں گھر واپس آنا پڑا۔ چار سال بعد جب جائز طور پر آسٹریائی فوج میں بھرتی ہوئے تو ایک تو

جنگ ختم ہوگئی دوسرے یہ کہ فوجی کریئر سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اب وہ روحانی سکون کی تلاش میں تھے؛ وہ سوچتے تھے کہ روحانی سکون دنیا میں کہیں تو ضرور پایا جاتا ہوگا لیکن کہاں... یہ انھیں معلوم نہ تھا۔

ان کے والد کا اصرار تھا کہ وہ پی ایچ ڈی کرلیں لیکن محمد اسد ایک قلم کار بننا چاہتے تھے۔ 1920 میں جرنلزم میں اپنا کریئر بنانے کا خواب لے کر وہ ایک بار پھر گھر سے بھاگ نکلے۔ آپ گھر سے بھاگ تو نکلے لیکن بہت جلد فاقوں کی نوبت آ گئی، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ سخت عسرت کے باوجود آپ نے اپنے والد یا رشتے داروں کو پیسوں کے لیے نہیں لکھا۔ وہ اپنی دنیا سے اکتا سے گئے تھے ایک عجیب سی بے چینی تھی جو انھیں گھر پر ٹکنے نہ دیتی تھی۔ ان کے والد نے اس زمانے میں انھیں ایک سخت خط لکھا کہ: میں تمھارا مستقبل دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک سڑک چھاپ زندگی بسر کرنے کے بعد کسی سڑک کنارے مرے ہوئے پائے جاؤ گے۔ محمد اسد نے جوابی خط میں کہا کہ میں ضرور اونچائیوں پر پہنچوں گا۔

لیکن اونچائیوں پر پہنچنے کی باتیں کرنا اور خواب دیکھنا جتنا آسان ہے، انھیں سر کرنا اتنا ہی مشکل۔ محمد اسد کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں۔ انھوں نے بڑے بڑے روزناموں میں صحافی بننے کے لیے انٹرویوز دینے شروع کیے اور ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھا۔ ایک ایسے نوخیز لڑکے کو جسے صحافت کا کوئی تجربہ نہ ہو اور جس نے زندگی بھر ایک سطر بھی نہ چھاپی ہو اسے بطور صحافی کوئی بھی نوکری دینے کا روادار نہ تھا۔ فاقہ محمد اسد کا معمول ہوگیا۔ آخر کار ایک دن ان کی ملاقات فلم ڈائریکٹر ایف ڈبلیو مرناؤ سے ہوئی۔ مرناؤ نے انھیں اپنا اسسٹنٹ بنالیا۔ بعدازاں انھوں نے پیسوں کے لیے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کچھ فلمی مناظر کی اسکرپٹس بھی لکھیں۔ لیکن ان کی ساری توجہ ایک صحافی بننے پر مرکوز تھی۔ بہت کوششوں کے بعد 1921 میں انھیں ایک نئی نیوز ایجنسی United Telegraph میں ٹیلیفونسٹ کی نوکری ملی۔ مرتا کیا نہ کرتا، اپنی قسمت پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے اس نوکری کو قبول کرلیا۔ ٹیلیفونسٹ کی نوکری کے دوران ایک دن انھوں نے زبردستی نیوز ایڈیٹر سے پریس کارڈ مانگا اور ایک Celebrity میڈم گورکی کا سنسنی خیز انٹرویو لے آئے۔ دراصل میڈم گورکی خفیہ طور پر شہر میں آئی ہوئی تھیں اور اس کی اطلاع انھیں ایک چوکیدار دوست سے ملی تھی۔ جہاں برلن کے کسی اخبار اور نیوز

ایجنسی کو میڈم گورکی کے شہر میں ہونے کی بھنک تک نہیں تھی وہیں United Telegraph ایجنسی کے اخباروں نے اس انٹرویو کو پہلے صفحے پر چھاپا تھا۔ اس سنسنی خیز انٹرویو کے چھپنے پر بالآخر محمد اسد کو صحافی بنالیا گیا۔

روڈتومکہ: اپنے آبائی مذہب یہودیت سے مایوس ہونے کے بعد آپ الحاد کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ لیکن ملحدانہ خیالات اور مادہ پرست نظریات، کبھی آپ کو مطمئن نہ کر سکے۔ مطالعہ چونکہ بچپن سے ہی وسیع تھا لہٰذا آپ نئے افکار و خیالات سے بخوبی واقف تھے۔ جدید فلسفۂ سائنس کے مطالعے سے وہ ایک الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔ انھیں نئی سائنس کا غرور بالکل پسند نہیں تھا۔ انھیں نئے نظریات مثلاً فرائیڈ کا نظریہ وغیرہ انسانیت کے لیے سم قاتل لگتا تھا۔ محمد اسد کا اضطراب بڑھتا رہا۔ وہ اپنی زندگی سے ناخوش نہیں تھے لیکن ایک طرح کی بے اطمینانی تھی جو روحانی خلا کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ سچ تک ضرور پہنچیں گے۔

اس دوران آپ نے حق کی تلاش جاری رکھی۔ سترہ سال کی عمر میں آپ ایک جرمن ترجمے کی مدد سے چینی مصلح لاؤتسے کے فلسفے سے آشنا ہوئے، یہ روحانی طور پر ان کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اپنے آبائی مذہب یہودیت سے بیزار ہونے کے بعد آپ نے عیسائیت کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ عیسائیت میں خدا کا تصور یہودیت کے خدا کے تصور سے ممتاز تھا۔ یہ خدا ساری کائنات کا خدا ہے اور رحیم و غفور ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے عیسائیت کی فلسفیانہ موشگافیوں خصوصاً تثلیث کے غیر عقلی و غیر فطری عقیدے نے انھیں عیسائیت سے بھی مایوس کر دیا۔

1922 میں انھیں یروشلم میں مقیم اپنے ماموں کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے محمد اسد کو کچھ مہینوں کے لیے یروشلم آنے، گھومنے پھرنے اور ساتھ رہنے کی دعوت دی؛ اور سارا خرچ خود اٹھانے کا وعدہ کیا۔ اس وقت فلسطین برطانوی انتداب کے زیر تسلط تھا۔ گھومنے پھرنے کے شائق محمد اسد نے United Telegraph سے استعفیٰ دیا اور یروشلم روانہ ہو گئے۔ یہاں آپ نے بطور فری لانس جرنلسٹ کام کرنا شروع کیا اور متعدد اخبارات و رسائل میں چھپنے لگے۔ 1922 کے اخیر میں آپ نے جرمنی کے چند بڑے بڑے اخبارات کو درخواستی خطوط لکھے اور اس طرح جرمنی سے نکلنے والے Frankfurter Zeitung نے شرق اوسط میں انھیں اپنا نمائندہ صحافی بنالیا۔ یہ اخبار یورپ کے

چند مشہور ترین اخباروں میں شامل تھا۔آپ نے لکھنے کی خداداد صلاحیت پائی تھی، علاوہ ازیں عام متعصب یہودیوں کے طرز سے ہٹ کر لکھتے تھے۔ ان کے مضامین عموماً مقامی عرب آبادی کے اندیشوں کے ترجمان اور صہیونی و برطانوی منصوبوں کے خلاف ہوا کرتے تھے۔اس زمانے میں آپ کی انصاف پسندی کی وجہ سے آپ کا شمار ان یہودیوں میں ہوتا تھا جو صہیونیت کے خلاف تھے۔

ایک دوست کے گھر آپ کی ملاقات مشہور برطانوی صہیونی لیڈر ڈاکٹر وائز مین سے ہوگئی ۔ جب وائز مین نے یہودیوں پر توڑے جانے والے مصائب وآلام کا تذکرہ کیا اور فلسطین میں یہودیوں کے وطن کی بات کی تو انھوں نے کھڑے ہوکر سوال کیا کہ عربوں کا کیا ہوگا جو وہاں پچھلے دو ہزار سال سے آباد ہیں؟ وائز مین نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ فلسطین یہودیوں کا آبائی وطن ہے جہاں ایک طویل مدت تک وہ رہ چکے ہیں، حکومت کر چکے ہیں۔محمد اسد نے ان سے پوچھا کیا مسلمان جو سات سو سال تک اسپین پر حکومت کر چکے ہیں، اسی منطق کے تحت اسپین کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔وائز مین نے کہا کہ اسپین مسلمانوں کا وطن نہیں تھا، انھوں نے اسپین فتح کیا تھا۔محمد اسد نے کہا کہ فلسطین بھی یہودیوں کا وطن نہیں تھا، انھوں نے بھی اسے فتح کیا تھا۔ وائز مین نے اس نوجوان اور اس کے سوالات سے پریشان ہوکر بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔

محمد اسد نے عرب لوگوں میں سخت ماحول، غربت، اور ہر طرح کی پریشانیوں کے باوجود ایک جذباتی آسودگی پائی؛ وہ جذباتی وروحانی آسودگی جس کی اپنے اندر انھیں کمی محسوس ہوتی تھی، محمد اسد نے تہیہ کرلیا کہ اس جذباتی آسودگی کے منبع کا وہ پتہ لگا کر رہیں گے۔

Zeitung میں چھپے ان کے مضامین سے ان کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ایک سال تک اخبار کے لیے کام کر کے جب آپ جرمنی میں اخبار کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر سائمن سے ملے تو وہ اپنے سامنے تیئیس برس کے ایک لڑکے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔آپ نے اسی زمانے میں شرق اوسط کے تعلق سے اس نامی گرامی اخبار کا اداریہ لکھا۔بطور صحافی انھیں مسلم دنیا کی سیر کے خاطر خواہ مواقع ملے۔ ان مواقع سے کماحقہ استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے مصر، سعودی عرب، ایران، افغانستان اور سوویت یونین کے مسلم علاقوں کی سیر کی۔ان اسفار سے ان میں مسلمانوں کو جاننے، سمجھنے، اسلام کے مطالعے اور عربی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔وہ اسلامی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے، پھر عربی تو عربی، فارسی

بھی سیکھ لی۔

اسلامی تعلیمات آپ کے سامنے پہلے ایک مجرد نظریے کے طور پر سامنے نہیں آئیں بلکہ عرب ممالک کے اسفار کے دوران عرب بدوؤں کے اخلاق و کردار کی شکل میں آپ نے اسلام کا مجسم مشاہدہ کیا؛ اس کے بعد کتابوں کی طرف راغب ہوئے۔ ریل کے ایک سفر کے دوران آپ کے ایک انتہائی غریب ہم سفر عرب بدو نے جب کھانے کے لیے کوئی چھوٹی سی چیز خریدی تو اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیے اور باوجود خود بھوکا ہونے کے ایک ٹکڑے کو محمد اسد کی طرف بڑھا دیا۔ عرب ممالک کے متعدد سفر آپ نے بغیر پاسپورٹ وغیرہ کے پاپیادہ، اونٹوں یا گھوڑوں پر کیے۔ ان اسفار کے دوران آپ کو کبھی کھانے پینے رہنے سہنے کی پریشانی نہیں ہوئی۔ جس گاؤں میں شام ہوتی وہاں کے لوگ باصرار انھیں اپنا مہمان بنا لیتے، اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ سے عمدہ تواضع کرتے، رات بھر ٹھہراتے اور صبح کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کرتے۔ کسی کو صلے کی کوئی توقع نہیں تھی، کوئی پلٹ کر پوچھتا تک نہ تھا کہ آپ کون ہیں، کیا ہیں، کیوں ہیں؟ ایسی ہی بے غرض مہمان نوازی کا نتیجہ تھا کہ پھوٹی کوڑی نہ ہونے کے باوجود آپ کسی فکر کے بغیر عرب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرتے رہے۔

اپنے اسفار کے دوران عربوں کی صرف مہمان نوازی نہیں دیکھی بلکہ آپس میں بھی ان کے اخلاق کا مشاہدہ کیا۔ انھیں عرب تاجروں کی اخوت و بھائی چارگی نے خوب متاثر کیا۔ وہ انھیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے دیکھتے، دل کھول کر ہنستے دیکھتے، ان کے گرم جوش مصافحوں اور پرزور معانقوں کو دیکھتے، ایک دوسرے کی خوشی وغم میں دل سے شریک ہوتے دیکھتے۔ انھیں سب سے زیادہ اس چیز نے متاثر کیا کہ ایک گاہک جو دکاندار کی غیر حاضری میں دکان پر آتا اور انتظار کرنے کے بدلے پڑوس کی دکان میں جانے ہی والا ہوتا کہ پڑوس کا دکاندار خود گاہک کے پاس آجاتا اور گاہک کو جو چاہیے اسے دیتا اور رقم اپنے غیر حاضر دکاندار بھائی کی میز پر رکھ کر اپنی دکان میں واپس چلا جاتا۔ ایسی تجارت کا مغرب میں کوئی تصور نہ تھا، وہاں تو دولت کمانے کی ایک دوڑ اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ کر خود آگے بڑھ جانے کا جذبہ تھا۔ انھوں نے سوچا کہ؛ میں جس قوم سے آیا ہوں وہاں فرد اور فرد کے درمیان دیواریں حائل ہیں، پورا معاشرہ دیواروں سے پٹا پڑا ہے لیکن یہ کیسا معاشرہ ہے جس میں اتنا کھلا پن اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ وہ نام نہاد ترقی یافتہ مغرب کے خود غرض اور مادہ پرست سماج سے نکل کر

آئے تھے، اور انسان اتنے بے لوث، اتنے سادہ، اتنے مخلص بھی ہو سکتے ہیں اس کا انھیں اندازہ بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں کے معاملات میں انھیں کہیں دورخاپن نظر نہیں آیا، ہر چیز صاف شفاف نظر آئی۔ انھوں نے مسلمانوں کو بہت غریب لیکن دولتِ اخلاق سے مالا مال پایا۔

ان کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ عربی قوم کے مخصوص اخلاق ہوں، اور اس کی وجہ ان کا مخصوص تہذیبی ڈھانچہ ہو لیکن غیر عرب مسلمانوں سے مل کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ نہیں یہ اخلاق اسلام کی دین ہیں اور اسلام کی یہ برکات آفاقی ہیں جو لندن اور جینیوا میں بھی اتنی ہی باا ثر ہیں جتنی عرب کے ان ریگزاروں میں۔ اس طرح کے متعدد چھوٹے چھوٹے واقعات اور تجربات نے محمد اسد کا دل جیت لیا۔

عربوں کے اخلاق اور اسلامی تعلیمات، دھیرے دھیرے، محمد اسد کے دل میں گھر کرنے لگیں۔ مذاہب عالم پر ان کی نظر گہری تھی، اسلام کے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام نے جسمانی اور روحانی حقائق میں کوئی تضاد اور خلا نہیں چھوڑا ہے، دونوں کو اہمیت دی ہے اور کسی ایک کی بقا کے لیے دوسرے کو مٹا دینے والے غیر فطری طریقوں کی وکالت نہیں کی ہے۔ اسلام کا یہ اعتدال محمد اسد کو بہت پسند آیا۔ اسی اعتدال کی تلاش میں تو وہ تھے! نماز با جماعت نے انھیں بہت متاثر کیا۔ نماز انھیں دیگر مذاہب کی عبادات کی طرح زندگی کا ایک ضمیمہ یا بوجھ نہیں محسوس ہوئی بلکہ روزمرہ کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ محسوس ہوئی اور نماز سے بہتر عبادت بھلا کیا ہوسکتی تھی کہ جس خدا نے ہمارے جسم اور روح کو بنایا ہے اس کی عبادت جسم اور روح دونوں کے ساتھ کی جائے۔ حق اب ان پر واشگاف ہو چکا تھا، یہی تو وہ حقیقت تھی جس کے آپ متلاشی تھے۔

1926 میں آپ ماسکو اور پولینڈ کے راستے برلن پہنچے اور وہیں اسلام قبول کر کے Leopold Weiss سے محمد اسد ہو گئے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے نئے سرے سے مسلم ممالک کا دورہ شروع کیا۔ سعودی عرب میں تقریباً پانچ سال قیام پذیر رہے۔ اپنے سفر اور سعودی عرب کے قیام کے دوران محمد اسد پورے خطے میں مشہور ہو گئے۔ عرب ممالک کے بڑے بڑے لیڈران اور بادشاہوں تک سے ان کے مراسم تھے، جن میں ابن سعود (سعودی عرب)، رضا شاہ (ایران)، شاہ عبداللہ (اردن) اور سنوسی (شمالی افریقہ) وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔

اس دوران آپ نے ایک investigative صحافی کا کردار بھی بخوبی ادا کیا۔ 1927 میں آپ نے یمن کی بغاوت کے بارے میں فیلڈ رپورٹ دی کہ اس بغاوت کو برطانیہ کا تعاون حاصل ہے۔ آپ کے مضامین نے، جو یورپ اور عرب کے بڑے بڑے اخبارات میں چھپے، استعماری عزائم کا پردہ فاش کر دیا اور برطانیہ نے باغیوں کے تعاون سے ہاتھ کھڑے کر لیے، بغاوت فرو کر دی گئی۔

1932 میں محمد اسد ہندوستان آئے اور لاہور میں قیام کیا۔ یہیں انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب Islam at the Crossroads تحریر کی جو 1934 میں نیویارک سے چھپی۔ علامہ اقبالؒ بھی محمد اسد سے خاصے متاثر ہوئے اور اقبال کی ہی ایماء پر محمد اسد نے 1935 میں صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اس پر حواشی لکھے۔

جنگ عظیم دوم سے رفیق اعلیٰ تک: مسلم دنیا میں محمد اسد کی سرگرمیوں سے انگریز نالاں تھے۔ 1939 میں جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو محمد اسد کو نظر بند کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں نازیوں کے ہاتھوں ان کا خاندان لقمۂ اجل بنا دیا گیا۔ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ہی محمد اسد رہا ہو پائے۔ رہا ہو کر انھوں نے **عرفات** نامی ایک ماہنامے کا اجراء کیا۔ محمد اسد دو قومی نظریے کے پرجوش مبلغ تھے۔ وہ ایک آزاد اور صحیح معنوں میں اسلامی مملکت کا خواب دیکھتے تھے۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد اقوام متحدہ میں سفیر کی حیثیت سے انھوں نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ 50-1949 میں وہ پاکستانی وزارت خارجہ سے منسلک رہے۔ وہ اسلامی قانون کے ماہر تھے اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے انھوں نے انتھک جدوجہد کی۔ پاکستانی حکام نے جب اسلامی قوانین کے نفاذ میں آنا کانی شروع کی تو یہی وہ محمد اسد تھے جنہوں نے قرارداد مقاصد تحریر کرنے کا کارنامہ انجام دیا، جس پر پوری قوم کا اجماع ہوگیا۔ تمام مسلمانوں اور مسلم جماعتوں نے، جو اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پاکستان میں نافذ کرنا چاہتی تھیں، جب مل کر زور لگایا تو یہی قرارداد مقاصد پاکستانی دستور کی تمہید قرار پائی اور کم از کم دستوری لحاظ سے پاکستان ایک 'اسلامی' ملک بن گیا۔

1953 میں انھیں پاکستان کا سفیر مختار بنا کر **اقوام متحدہ** بھیجا گیا، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ایک سال کے اندر اندر انہوں نے اس منصب سے استعفیٰ دے دیا۔

1954 میں اپنے قبول اسلام کی داستان انھوں نے روڈ ٹو مکہ نامی کتاب میں بیان کی جس کی مقبولیت آج بھی قابل رشک ہے، متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھوں نے براعظم امریکہ کے لیے رخت سفر باندھا پھر لبنان کا دورہ کیا۔

1957 میں پاکستانی حکومت نے انھیں ایک عالمی اسلامی جلسہ منعقد کرنے کی ذمہ داری سونپی جس سے وہ بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ 1961 میں انھوں نے The Principles of State and Government in Islam لکھ کر موجودہ دور میں ایک اسلامی حکومت کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کتاب یقیناً ان لوگوں کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب تھا جو بیسویں صدی میں اسلامی قوانین اور نظام مملکت کو قابل نفاذ نہیں سمجھتے تھے۔

پچاس کے دہے کے اخیر سے ہی انھوں نے قرآن کے انگریزی ترجمے پر کام شروع کر دیا تھا۔ 1980 میں ان کا یہ ترجمہ مع مختصر حواشی The Message of the Quran کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اسی سال اسلامی قانون پر ان کی کتاب This Law of ours شائع ہوئی۔

زندگی کے آخری ایام موصوف نے اسپین میں گزارے۔ پاکستان کو ایک نمائندہ اسلامی مملکت کے طور پر دیکھ پانے کی ان کی حسرت، ان کی زندگی میں تو پوری نہیں ہو پائی۔ اور وہ اسی خواب کو آنکھوں پر سجائے 20 فروری 1992 کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرے اور ان کی سعی و جہد پر انھیں بے پناہ اجر و ثواب سے نوازے۔ آمین!